دیباچۂ اسرارِ خودی

نوشتۂ علامہ اقبال

یہ وحدتِ وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات
و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں، یہ پُراسرار شے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود
کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے، یہ خودی یا انا یا "میں" جو اپنے عمل کی رُو سے ظاہر
ہے لیکن اپنی حقیقت کی رُو سے مضمر ہے، جو تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر جس
کی لطافت، مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی، کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک
لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی
خاطر، اپنے آپ کو اس فریبِ تخیل یا دروغِ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا
ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد و اقوام کا طرزِ عمل، اس نہایت ضروری سوال کے جواب
پر منحصر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس کے حکماء و علماء نے
کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کے لیے دماغ سوزی نہ کی ہو۔
مگر اس سوال کا جواب، افراد و اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا
جس قدر کہ ان کی افتادِ طبیعت پر۔ مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اسی نتیجہ کی
طرف مائل ہوئیں کہ انسانی انا محض ایک فریبِ تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے
اتار دینے کا نام نجات ہے۔ مغربی اقوام کا عملی مذاق ان کو ایسے نتائج کی طرف
لے گیا جس کے لیے ان کی فطرت متقاضی ہے۔

(۲) ہندو قوم کے دل و دماغ میں عملیات و نظریات کی ایک عجیب طریق سے
آمیزش ہوئی ہے۔ اس قوم کے موشگاف حکماء نے قوتِ عمل کی حقیقت پر نہایت
دقیق بحث کی ہے، اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انا کی حیات کا یہ مشہود تسلسل
جو تمام آلام و مصائب کی جڑ ہے۔ عمل سے متعین ہوتا ہے، یا یوں کہیے کہ انسانی
انا کی موجودہ کیفیات اور لوازمات اس کے گذشتہ طریقِ عمل کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اور
جب تک یہ قانونِ عمل اپنا کام کرتا رہے گا وہی نتائج پیدا ہوتے رہیں گے۔
انیسویں صدی کے مشہور شاعر گوئٹے کا ہیرو فاؤسٹ جب انجیل یوحنا کی پہلی آیت

میں لفظ "کلام" کی جگہ لفظ "عمل" پڑھتا ہے (ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے
ساتھ تھا، اور کلام خدا تھا) تو حقیقت میں اس کی دقیقہ رس نگاہ اس نکتہ کو دیکھتی ہے جس کو
ہندو حکماء نے صدیوں پہلے دیکھ لیا تھا۔ اس عجیب و غریب طریق پر ہندو حکماء نے تقدیر کی
مطلق العنانی اور انسانی حریت یا الفاظ دگر، جبر و اختیار کی گتھی کو سلجھایا۔ اور اس میں
شک نہیں کہ فلسفیانہ لحاظ سے ان کی جدت طرازی داد و تحسین کی مستحق ہے۔ اور
بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ ایک بہت بڑی اخلاقی جرأت کے ساتھ ان تمام فلسفیانہ نتائج
کو بھی قبول کرتے ہیں جو اس قضیہ سے پیدا ہوتے ہیں، یعنی یہ کہ جب انا کا تعین عمل سے
ہے، تو انا کے پھندے سے نکلنے کا ایک ہی طریق ہے اور وہ ترک عمل ہے۔ یہ نتیجہ انفرادی اور ملی
دونوں پہلوؤں سے نہایت خطرناک تھا۔ اور اس بات کا مقتضی تھا کہ کوئی مجدد پیدا ہو
جو ترک عمل کے اصلی مفہوم کو واضح کرے۔ بنی نوع انسان کی ذہنی تاریخ میں شری کرشن کا
نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جائے گا کہ اس عظیم الشان انسان نے ایک نہایت دلفریب
پیرایہ میں اپنے ملک و قوم کی فلسفیانہ روایات کی تنقید کی اور حقیقت کو آشکار کیا کہ ترک عمل
سے مراد ترک کلی نہیں ہے، کیونکہ عمل اقتضائے فطرت ہے اور اسی سے زندگی کا استحکام ہے
بلکہ ترک عمل سے مراد یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتائج سے مطلق دل بستگی نہ ہو۔ شری کرشن کے
بعد شری رام نوج اچاریہ بھی اسی رستے پر چلے مگر افسوس ہے کہ جس عروس معنی کو شری کرشن
اور شری رام نوج بے نقاب کرنا چاہتے تھے، شری شنکر اچاریہ کے منطقی طلسم نے اسے
پھر محجوب کر دیا۔ اور شری کرشن کی قوم ان کی تجدید کے ثمرات سے محروم رہ گئی۔

(۳) مغربی ایشیا میں اسلامی تحریک بھی ایک نہایت زبردست پیغام عمل تھی گو
اس تحریک کے نزدیک (ہندو فلسفہ کے خلاف) انا ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل سے
لازوال ہو سکتی ہے۔ مگر مسئلہ انا کی تحقیق و تدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ
میں ایک عجیب و غریب مماثلت ہے۔ اور وہ یہ کہ جس نقطۂ خیال سے شری شنکر اچاریہ نے
گیتا کی تفسیر کی تھی اسی نقطۂ خیال سے شیخ محی الدین ابن عربی اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی

جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔ شیخ اکبر کے علم و فضل اور ان کی زبردست
شخصیت نے مسئلہ وحدۃ الوجود کو جس کے وہ انتھک مفسر تھے، اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا
دیا۔ اوحدالدین کرمانی اور فخر الدین عراقی ان کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ

چودھویں صدی عیسوی کے تمام عجمی شعرا اس رنگ میں رنگین ہو گئے۔ ایرانیوں کی نازک مزاج اور لطیف الطبع قوم اس طویل مشقت کی کہاں متحمل ہو سکتی تھی، جو جزو سے کل تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے انہوں نے جزو اور کل کا دشوار گزار درمیانی فاصلہ تخیل کی مدد سے طے کر کے "رگِ چراغ" میں "خونِ آفتاب" کا اور "شرارِ سنگ" میں "جلوۂ طور" کا بلاواسطہ مشاہدہ کیا۔

(۴) مختصر یہ کہ ہندو حکما نے مسئلہ وحدۃ الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب بنایا مگر ایرانی شعرا نے اس مسئلہ کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا یعنی انہوں نے دل کو اپنی آماجگاہ بنایا اور ان کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا انجام کار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلہ نے عوام تک پہنچ کر قریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔ علمائے قوم میں سب سے پہلے غالباً امام ابن تیمیہؒ نے اور حکما میں واحد محمود نے اسلامی تخیل کے اس ہمہ گیر میلان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ مگر افسوس ہے کہ واحد محمود کی تصانیف آج ناپید ہیں۔ ملا محسن فانی کشمیری نے "دبستان مذاہب" میں اس حکیم کا تھوڑا سا تذکرہ لکھا ہے جس سے اس حکیم کے خیالات کا پورا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ابن تیمیہ کی زبردست منطق نے کچھ نہ کچھ اثر ضرور پیدا کیا۔ مگر حق یہ ہے کہ منطق کی خشکی، شعر کی دلربائی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

شعرا میں شیخ علی حزیں نے یہ کہہ کر کہ "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ وہ حقیقت حال سے آگاہ تھا مگر با وجود اس بات کے اس کا کلام شاہد ہے کہ وہ بھی اپنے گرد و پیش کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ان حالات میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ ہندوستان میں اسلامی تخیل اپنے عملی ذوق کو محفوظ رکھ سکتا۔

مرزا بیدل، لذتِ سکون کے اس قدر دلدادہ ہیں کہ ان کو جنبش نگاہ تک گوارا نہیں:۔

نزاکت ہاست در آغوش مینا خانۂ حیرت
مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را

اور امیر مینائی مرحوم یہ تعلیم دیتے ہیں:۔

دیکھ جو کچھ سامنے آجائے مونھ سے کچھ نہ بول
آنکھ آئینہ کی پیدا کر، دہن تصویر کا

(۵) مغربی اقوام اپنی قوت عمل کی وجہ سے تمام اقوام عالم میں ممتاز ہیں۔ اور اسی وجہ سے اسرار زندگی کو سمجھنے کے لیے ان کے ادبیات و تخیلات، اہل مشرق کے واسطے بہترین رہنما ہیں۔ اگرچہ مغرب کے فلسفۂ جدید کی ابتدا، ہالینڈ کے اسرائیلی فلسفی کے نظام وحدۃ الوجود سے ہوتی ہے۔ لیکن مغربی طبائع پر رنگ عمل غالب تھا۔ اس لیے وحدۃ الوجود کا یہ طلسم جسے ریاضیات کے طریق استدلال سے پختہ کیا گیا تھا۔ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ سب سے پہلے جرمنی میں انسانی انا کی انفرادی حقیقت پر زور دیا گیا اور رفتہ رفتہ فلاسفۂ مغرب بالخصوص حکمائے انگلستان کے علمی ذوق کی بدولت، اس خیالی طلسم کے اثر سے آزاد ہو گئے۔ جس طرح رنگ و بو کے لیے مختلف حواس ہیں، اسی طرح انسانوں میں ایک اور خاصہ بھی ہے۔ جسے ہیں

"حسِ واقعات" سے تعبیر کرتا ہوں۔ ہماری زندگی، واقعاتِ گردوپیش کے مشاہدہ کرنے اور ان کے صحیح مفہوم کو سمجھ کر عمل پیرا ہونے پر منحصر ہے۔ مگر ہم میں کتنے ہیں جو اس قوت سے کام لیتے ہیں۔ جس کو میں نے "حسِ واقعات" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے؛ نظامِ قدرت کے پراسرار بطن سے ہر وقت مختلف واقعات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ مگر بیکن سے پہلے کون جانتا تھا کہ یہ واقعات حاضرہ جن کو نظریات کے دلدادہ فلسفی اپنے تخیل کی بلندی سے بنگاہِ حقارت دیکھتے ہیں اپنے اندر حقائق و معارف کا ایک گنج گراں مایہ پوشیدہ رکھتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ انگریزی قوم کی عملی نکتہ رسی کا احسان تمام دنیا کی قوموں پر ہے کہ اس قوم میں حسِ واقعات اور اقوامِ عالم کی نسبت زیادہ تیز اور ترقی یافتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی "دماغ بافتہ" فلسفیانہ نظام جو واقعات متعارفہ کی تیز روشنی کا متحمل نہ ہو سکتا ہو۔ انگلستان کی سرزمین میں آج تک مقبول نہیں ہوا۔ پس حکمائے انگلستان کی تحریریں ادبیاتِ عالم میں ایک خاص پایہ رکھتی ہیں اور اس قابل ہیں کہ مشرقی دل و دماغ ان سے مستفید ہو کر اپنی قدیم فلسفیانہ روایات پر نظرِ ثانی کریں۔

(۱۲) یہ ہے ایک مختصر سا خاکہ اس مسئلہ کی تاریخ کا جو اس نظم کا موضوع ہے میں نے اس دقیق مسئلہ کو فلسفیانہ دلائل کی پیچیدگیوں سے آزاد کر کے تخیل کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ اس کی حقیقت کو سمجھنے میں اور غور کرنے میں آسانی پیدا ہو۔ اس دیباچہ سے اس نظم کی تفسیر مقصود نہیں ہے۔ محض ان لوگوں کو نشانِ راہ بتانا مقصود ہے جو اس سے پہلے اس عسیر الفہم حقیقت کی دشواریوں اور دقتوں سے آشنا نہیں مجھے یقین ہے کہ سطورِ بالا سے کسی حد تک یہ مطلب نکل آئے گا۔ شاعرانہ پہلو سے اس نظم کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ شاعرانہ تخیل محض ایک ذریعہ ہے اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کا کہ

لذتِ حیات "انا" کی انفرادی حیثیت، اس کے اثبات، استحکام اور توسیع سے وابستہ ہے۔ یہ نکتہ مسئلہ حیات مابعد الموت کی حقیقت کے سمجھنے کے لیے بطور ایک تمہید کے کام دے گا۔

(۷) ہاں لفظ خودی کے متعلق ناظرین کو آگاہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ لفظ اس نظم میں بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا تعینِ ذات ہے۔ مرکب لفظ بے خودی میں بھی اس کا یہی مفہوم ہے اور غالباً محسن تاثیر کے اس شعر میں بھی لفظ خودی کے یہی معنی ہیں :-

غریقِ قلزمِ وحدت دم از خودی نزند
بود محال کشیدن میانِ آب نفس